

تاریخ اسلام میں اہل حل و عقد کا تصور

عقد خالصعود

اہل حل و عقد کے تصور نے بالکل ابتدائی سالوں میں ہی تاریخ اسلام کو پیش آنے والے بہت بڑے بحران سے بچا لیا۔ اسلامی نظریہٴ حیات نے ابھی کسی منظم سماجی ادارے کی شکل اختیار نہیں کی تھی کہ حکومت کا ادارہ اچانک وجود میں آگیا۔ تحریک اسلام کا یہ نازک ترین مرحلہ تھا کیونکہ طاقت کے ایک دم ظہور سے یہ اندیشہ تھا کہ یہ کہیں ایسے ویوں کی صورت نہ اختیار کر لے جس پر اس کے خالق کو بھی اختیار نہ رہے بلکہ وہ خود اپنے خالق پر تصرف کرے اور اپنے لئے آپ قانون وضع کرے۔ اگر یہ ابتدائی دور خلفائے راشدین کے مدبر ہاتھوں میں نہ ہوتا، جو جمہوریت کے اہل حل و عقد ہونے کے عقیدے کے قائل تھے، تو عین ممکن تھا کہ یہ اندیشہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ نظریہٴ حیات کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ قوت و اقتدار کو نظریہٴ حیات کے تابع رکھا جائے۔ ابتدائی دور میں عملاً یہ صورت ناممکن نہیں ہو مشکل ضرور نظر آتی تھی۔ کیونکہ اقتدار کو متوازن رکھنے کے لئے کوئی متوازی ادارہ موجود نہیں تھا۔ اگر اقتدار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آگیا ہوتا جو اسلامی نظریہٴ حیات کی برتری کے قائل نہ ہوتے تو یہ صورت ناممکن ہی ہو جاتی۔ لیکن خلفائے راشدین حریت رائے، اجتہاد اور شوریٰ کی تدروں پر محکم عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے

دور نبوی کی حریت رائے کی روح کو زندہ رکھا اور شوری کو اس قدر اہمیت دی کہ اس نے آہستہ آہستہ اجماع کے ادائے کی ایک ابتدائی شکل اختیار کر لی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ عقیدہ بھی مستحکم ہوتا گیا کہ اقتدار و حکومت شریعت کے تابع ہے۔

اقتدار کے شریعت کے تابع ہونے کے عقیدے سے اسلام کی عالمگیریت کا تصور زیادہ مضبوط ہوا کیونکہ قرآن و سنت کی اساس پر قائم ہونے والی شریعت میں وہ لچک موجود تھی جو ہر قوم اور ہر زمانے کے لوگوں کی رہنمائی کر سکتی تھی۔ اسی سے وہ اعلیٰ اور ارفع وحدت قائم ہو سکتی تھی جو مختلف رسوم و رواج کے لوگوں کو یکجا کر سکے۔ وہ لچک دور نبوی کی پروردہ روح اجتہاد تھی۔ اسی کی ایک شکل شوری تھی۔

ابتدائی دور میں شوری کے عملی نفاذ سے ہی اقتدار کی اجارہ داری پر بندش ممکن ہو گئی۔ شوری کا یہی تصور آخر میں اجماع کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اور انہی اہل اجماع کو بعد میں اہل حل و عقد کہا جانے لگا۔ ہم آئندہ سطور میں قدرے تفصیل سے اسی تصور کا تجزیہ پیش کریں گے۔

اس تصور نے اگرچہ کبھی واضح اور منظم ادائے کی شکل اختیار نہیں کی، لیکن یہ تصور اسلام کی سیاسی تاریخ میں بنیادی طور پر ہر جگہ موجود رہا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ اوائل میں اسے شوری کا نام دیا گیا۔ تیسری خلافت کے انتخاب کے لئے شوری کا ادارہ پہلی دفعہ واضح صورت میں قائم بھی ہوا، لیکن اس کے بعد تاریخ میں ایسی منظم صورت میں نظر نہیں آتا۔ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس سوال سے ہم ذرا آگے چل کر بحث کریں گے۔

شوری نے کب چل کر "اہل حل و عقد" کی صورت اختیار کی؟ اور یہ اصطلاح کب مستعمل ہوئی؟ ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کرنا ہے۔ اس ادارے کے لئے اور بھی کئی نام استعمال ہوتے ہیں۔ جن کو تاریخی ارتقا سے متسوب نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ سیاستپن نے اپنے نظریات کے اعتبار سے ان اصطلاحات کو استعمال کیا ہے۔ زیادہ مستعمل اور شناسا الفاظ "ولاة الامر" اہل الشوریٰ، اہل المرأۃ، اہل الاجماع اور اہل الشوکتا^۱ ہیں۔ لیکن متاخرین میں اہل حل و عقد کی اصطلاح اتنی مقبول ہو گئی کہ دوسرے الفاظ تقریباً متروک ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترکیب اتنی موزوں تھی کہ جو کبھی کسی نے پہلی بار استعمال کیا علمائے اسے باقوں یا تقلید کیا۔ لیکن اس سے

پہلے کس نے استعمال کیا؟ یہ طے کرنا ذرا مشکل ہے بہر طور مطالعہ اور تحقیق سے ہم نے جو نتیجہ نکالا ہے اس کے لحاظ سے سب سے پہلے امام ابو الحسن علی اشعری (متوفی ۳۳۰ھ) کے ہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔ انہوں نے پہلی مرتبہ اسے اہل الشوری کے بدل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کی عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

و ثبتت امامة علی بعد عثمان بعقد
من عقد له من الصحابة من اهل الحل والعقد،
ولاحظه لم يدع احد من اهل الشوری
هجرة في وقته۔

حضرت عثمان کے بعد حضرت علی کی امامت
صحابہ میں سے اہل حل و عقد حضرات کی بیعت
سے ثابت ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ اہل شوری
نے حضرت علیؑ کو کسی کو خلافت کے لئے دعوت
نہیں دی۔

بعد میں یہ اصطلاح اشاعہ میں اکثر مستعمل رہی مثلاً ماوردی، جوینی اور اسفرائینی وغیرہ نے اسے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ ان کا ذکر آئندہ سطور میں ہوگا۔

اجماع کی بحث میں فقہاء کے لئے اہل الاجماع کا سوال سب سے اہم تھا۔ چنانچہ اصولیین اس ضمن میں بڑی تفصیلات میں جاتے ہیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کے ہاں بھی اہل کلام کی طرح بتدریج اہل حل و عقد کی اصطلاح راہ پاتی ہے۔ سیف الدین آمدی (متوفی ۷۳۱ھ) اجماع سے بحث کرتے ہوئے اہل حل و عقد کے اتفاق کو شرط قرار دیتے ہیں۔ متاخرین اصولیین کے ہاں تو اجماع کی تعریف ہی ان الفاظ میں کی جانے لگتی ہے۔

الاجماع هو اتفاق اهل الحل والعقد
من هذه الامة في امر من الامور

اجماع سے مراد اس امت کے اصحاب
حل و عقد کا کسی امر پر اتفاق ہے۔ (۹)

قرآن میں "اولو الامر" انہی معنوں میں آیا ہے۔ تابعین کے دور میں عام طور پر اس سے محض صحابہ امر و حکومت مراد لئے جاتے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی جابر بن عبد اللہ، مجاہد، ابی بن ابی طلحہ، عطاء بن السائب اور الربیع عام انداز سے ہٹ کر "اہل علم و فہم" مراد لیتے تھے۔ بعد میں اس مفہوم کو اور وسعت ملی۔ اور مفسرین نے بتدریج اہل حل و عقد کی اصطلاح کو اپنا لیا۔ یہاں تک کہ فخر الدین رازی (متوفی ۶۰۶ھ) کے نزدیک اولی الامر اور اہل حل و عقد

متراوف ٹھہرے۔

قولہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی
الامر منکم یقتضی وجوب طاعة جملة اهل
الحل والعقد من الامة۔

آیت اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم
یہ تقاضا کرتی ہے کہ امت کے تمام اہل حل و عقد
اصحاب کی اطاعت واجب ہے!۱۱

اس اصطلاح کا پہلا پہلو چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں مستعمل ہوتا معنی خیر ہے۔ اگر اس وقت
کے حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ نتیجہ عین منطقی معلوم ہوتا ہے۔

امام اشعری کی وفات ۳۳۰ھ میں متقی باللہ کے عہد میں ہوئی۔ ان دنوں اسلامی سلطنت
سخت انتشار میں مبتلا تھی۔ خلافت اپنا وقار کھو چکی تھی۔ یہ انتشار خلیفہ متوکل (۳۲۴ھ) کی وفات
سے شروع ہوا۔ اس کے بڑے بیٹے منتصر نے ترک فوجی جرنیلوں کی مدد سے اپنے باپ کو قتل کیا
اور تخت خلافت پر متمکن ہوا۔ اس کا وزیر فتح بن خاقان تھا۔ منتصر نے ۳۲۸ھ میں وفات پائی ترکوں
کے ہاتھوں میں اس کی حیثیت کچھ بڑی سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کا جانشین مستعین باللہ (۳۲۵ھ) تو مکمل
طور پر ترکوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا۔ چنانچہ سیوطی کہتا ہے۔

خلیفۃ فی قہض، بین و صیف و ذفا
یقول ما قال الامة کما تقول الیغیا
خلیفہ وصیف اور بفا، ترک فوجی افسروں کے
ہاتھوں قہض میں ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں، بولتا ہے
جیسے طوطی بولتا ہے!۱۲

[دیس آئینہ طوطی صفحہ ۱۱۱ داشتہ اند
ہر چہ استاذ ازل گفت ہما می گویم]
ترک جرنیلوں نے اسے بھی جلد معزول کر دیا اور اس کی جگہ معتز کو تخت خلافت پر بٹھایا
خلفا میں سے کوئی بھی اس قدر کم سنی میں تخت پر نہیں بیٹھا۔^{۱۳} خلیفہ کا ذاتی وقار اب بالکل ختم
ہو چکا تھا ابن الطقطقی نے اس ضمن میں ایک بہت ہی دلچسپ لطیفہ نقل کیا ہے جس سے اس وقت
کی حالت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

”معتز تخت پر بیٹھا، تو دربار کے امرائے حسب دستور خوجیوں کو بلا بھیجا۔ ان سے پوچھا
کہ خلیفہ کتنی عمر پائے گا؟ کوئی ظریف الطبع بھی دربار میں موجود تھا۔ اس نے کہا خوجیوں
کی بجائے یہ سوال ترکوں سے دریافت کرنا چاہیے!۱۴

یہ نژک اپنی خواہش سے خلیفہ کا عزل و نصب کرتے۔ مولانا خادم، مقتدر کے عہد کا ایک ممتاز میر تقی۔ اس نے مقتدر کے خلاف بغاوت کی اور تخت پر قبضہ کر کے اسے معزول کر دیا۔ اور فر ۳۲۰ میں اس نے بڑی بے رحمی سے مقتدر کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد قابوس بن ولید نے اسے بھی معزول کر دیا۔ عباسی سلطنت کا یہ دور انتہائی انتشار کا دور تھا۔ کئی خود مختار طاقتیں ابھر رہی تھیں، جس سے عباسی سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے خلیفہ راضی (۳۲۲ - ۳۲۹) نے اس کی اصلاح کے لئے فوج کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دبانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اس نے امیر الامرا کا ایک نیا عہدہ مقرر کیا۔ بصرہ کا گورنر ابن رائق پہلا امیر الامرا مقرر ہوا۔ جلد ہی اندرونی طور پر ابن رائق ایک آمر کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اور اس کی گرفت خلیفہ پر اتنی مضبوط ہو گئی کہ اس نے خلیفہ سے عملی طور پر تمام اختیارات چھین لئے۔

راضی کو ابن رائق کا یہ اقتدار بے حد ناگوار گذرا۔ اس نے اس کی جگہ ابن بجم کو متعین کر دیا۔ تاکہ دونوں ایک دوسرے سے برس برس پر یکا کر رہیں اور ابن رائق کی بڑھتی ہوئی گرفت کمزور پڑ سکے لیکن ابن رائق زیادہ طاقتور تھا۔ ان کے درمیان ۵ سال تک خونریز لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر اس نے ابن بجم کو بری طرح شکست دے کر قتل کر دیا اور خود سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔

یہ ہے امام اشعری کے زمانے کا ایک سرسری جائزہ۔ یہ مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ ان حالات سے متاثر ہو کر لوگ امرا اور فوجی جرنیلوں کے متعلق سوچنے لگے ہوں کہ انھیں حل و عقد کے اختیارات حاصل ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصطلاح انہی دنوں رائج ہوئی اور اس زمانے میں عوام میں اس کا استعمال بہت عام ہو چکا ہوگا۔ اس لفظ کے مفہوم میں ایک با اختیار قوت کا تصور موجود ہے۔ اسی لئے اس کا استعمال وہیں رونما ہوتا ہے جہاں فوجی طاقت برسر اقتدار ہو چاہیے۔ اشعری نے پہلے ان الفاظ کو اسی سیاق میں استعمال کیا ہے۔ وہ خلیفائے ابولہٰجی امامت سے بحث کرتے ہوئے صرف حضرت علیؑ کی خلافت کے بارے میں اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں۔

فقد حصل الاجماع والالتفاق علی
امامة ابی بکر الصدیق واذا ثبتت امامة
الابوبکر صدیق تھکی خلافت پر سب کا اجماع اور
التفاق ہو گیا۔ جب صدیقؑ کی امامت ثابت ہوگی
تو فاروقؑ کی امامت بھی ثابت ہو جاتی ہوگی۔

الصديق اُمّ عليه ومقدّمه الامامة
واختاره لها وكان افضلهم بعد
ابي بكر وثبتت امامة عثمان بعد عمر
بعقد من عقده الامامة من اصحاب
الشورى الذين نصّ عليهم عمر
فاختاروه ورضوا بامامته وثبتت
امامة علي بعد عثمان بعقد من عقده
من الصحابة من اهل الحل والعقد فلا
لم يدع احد من اهل الشورى
غيره في وقته -

حضرت صدیق نے اس کی تفصیل فرمائی تھی اور
فاروق کو نامزد کیا تھا اور یہ کہ حضرت ابو بکرؓ
کے بعد میری افضل الصحابہ تھے۔ پھر حضرت
عثمانؓ کی امامت اصحاب شوریٰ کے عقد سے
ثابت ہوئی، جن کو حضرت عمرؓ نے نامزد کیا تھا۔
انہوں نے آپ کا انتخاب کیا اور آپ کی امامت
پر رضامند ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت
علیؓ کی بیعت صحابہ میں سے اہل حل و عقد حضرات
کے عقد سے ثابت ہوئی، کیونکہ انہوں نے اس
زمن میں حضرت علیؓ کے سوا کسی کو خلافت کی دعوت نہیں دی

تاریخی جائزہ

جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا ہے یہ ادارہ پہلے پہل حضرت عمرؓ نے تیسری خلافت کے انتخاب کے
لئے قائم کیا۔ اسے مجلس شوریٰ کا نام دیا گیا۔ پہلے دو خلفا کا انتخاب اس مجلس کے ذریعہ نہیں ہوا۔
حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں عمل میں آیا اور حضرت عمرؓ نامزد ہوئے۔ ان دو خلفا کا
انتخاب کرنے والے لوگ مدینہ کے ممتاز ہاجرا اور انصار تھے۔ لیکن انتخاب کا باقاعدہ ادارہ پہلے پہل
حضرت عمرؓ ہی نے تجویز کیا۔

حضرت علیؓ کا انتخاب انتہائی نازک حالات میں ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگ
حضرت علیؓ کے پاس خلافت کی پیشکش لے کر آئے۔ حضرت علیؓ نے ان کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا
کیونکہ ان میں اصحاب شوریٰ شامل نہیں تھے۔ ابن قتیبہ اس واقعہ کی پوری تفصیل دیتے ہیں اور حضرت
علیؓ کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں۔

لوگ حضرت علیؓ کے گھر آئے اور کہا

فانواعلیا فی حارۃ - فقالوا

نبایعک، فدیك، لابدمن امیر
فانت احتیجا۔ فقال: لیس نلک
الیکم، اتماھولاهل المشوری واهل
بدر فمن رضی بہ اهل المشوری
واهل بدر فهو خلیفة۔

ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں۔ ہاتھ بڑھائیے
ایک نہ ایک امیر ہونا ضروری ہے۔ اور آپ
سب سے زیادہ اہل ہیں۔ آپ نے فرمایا۔
یہ تمہارا کام نہیں۔ یہ کام اہل شوریٰ اور اہل بدر
کا ہے جس کی خلافت پر یہ لوگ رضامند ہو جائیں
وہی خلیفہ ہوگا۔^{۱۶}

دوسرے مورخین نے بھی اس واقعہ کو اسی طرح بیان کیا ہے۔ طبری نے بھی حضرت علیؑ کی
بیعتِ خلافت کی تفصیل درج کی ہے۔ اس کے نزدیک مہاجرین اور انصار اہل انتخاب تھے۔
جنہوں نے سب سے پہلے بیعت کی اور ان کے حلف کے بعد عام لوگ بیعت کے لئے آئے چنانچہ
وہ بکھتے ہیں۔

فلما دخل المهاجرون والانصار
فبايعوه، ثم بايعه الناس۔
جب مہاجرین اور انصار بیعت میں داخل ہو چکے
تب عام لوگوں نے بیعت کی۔^{۱۷}

یہ شوریٰ کا دور تھا۔ جب اقتدار اموی خاندان میں منتقل ہوا صل و عقد کے اختیارات بھی اموی خاندان
کے سربراہ دروہ لوگوں کے ہاتھ میں آگئے۔ اسی دوران میں یزید کی تخت نشینی کا سوال اٹھا۔ اگرچہ اموی
برسر اقتدار تھے لیکن شوریٰ کا تصور خواہ وہ موہوم سا ہی کیوں نہ ہو، ابھی موجود تھا۔ اور مدینہ
کے لوگوں کی بیعت لازمی سمجھی جاتی تھی۔ حضرت معاویہ اور یزید نے اہل مدینہ کی رضامندی حاصل
کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن حضرت حسینؑ اور ابن زبیر برابر مخالف رہے۔ کربلا کے حادثہ نے اہل مدینہ
کی اس رہی سہی طاقت کا تصور بھی ختم کر دیا۔ اور صل و عقد کے اختیارات مکمل طور پر امویوں کے ہاتھ میں
آگئے۔ مروان کا انتخاب قبیلہ کلب کی طویل جدوجہد کے بعد عمل میں آیا۔ لیکن اس کے بعد ولی عہد کی
نامزدگی اور موروثی خلافت کے رواج نے یہ اختیار عملی طور پر امرائے سلطنت سے چھین لیا تھا۔ تاہم
ملکی امور میں انہیں کافی دخل تھا اور بعض اوقات وہ خلیفہ کو اس کی رائے بدلنے پر مجبور بھی کر سکتے تھے۔
چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیز کی نامزدگی اسی طرح عمل میں آئی۔ سلیمان بن عبد الملک کو رجا بن حیوٰة
شامی کندی نے مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی بجائے عمر بن عبد العزیز کو نامزد کرے۔^{۱۸} ۷۰ء تک

قبیلہ بنو کلب کا عمل دخل رہا۔ بنو امیہ کے آخری خلیفہ مروان نے کوشش کی کہ یہ اختیارات نقری قبیلہ میں منتقل ہو جائیں۔ لیکن یہ زوال کے ایام تھے اور وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ وہیں اثنا عشری بنو امیہ کی خلافت ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اب یہ اختیارات خاندان عباسی میں منتقل ہو گئے۔ لیکن حقیقتاً سیاسی اصولوں کے لئے خلافت ایرانی عنصر کی مرہون منت تھی۔ کیونکہ انہی کی مدد سے عباسی برسرِ اقتدار آئے تھے۔ منصور نے مکہ میں خطبہ دیتے وقت کہا :-

ایہا الناس - انما انا سلطان اللہ فی ارضہ ، اسو حکم بتوفیقہ ، و تسدیدہ ، و تائیدہ ، و حارسہ علی مالہ ، اعلیٰ فیہ بمشیئہ ، و ارادتہ ، و اعطیہ باذنہ ، فقد جعلنی اللہ علیہ قفلاً۔

اے لوگو! میں اللہ کی زمین پر اس کا سلطان ہوں۔ اس کی توفیق، تفویض اور تائید سے تم پر حکومت کرتا ہوں میں اس کے مال پر اس کی طرف سے نگران ہوں۔ اس کی مشیت اور ارادے کے مطابق عمل کرتا ہوں اس کی اجازت سے ہی عطایا دیتا ہوں۔ کیونکہ اللہ نے اپنے خزانے پر مجھے قفل بنا کر بھیجا ہے۔ (۱۹)

اس خطبے سے معلوم ہوتا ہے کہ عباسی خلافت میں خود نظریں خلافت میں تبدیلی آگئی تھی۔ ایرانی لوگ بادشاہت کے آسمانی ہونے کے قائل تھے اور بادشاہ کے حقوق آسمانی کا عقیدہ رکھتے تھے۔ چنانچہ اس طرح خلیفہ کے انتخاب اور امت کے سامنے جواب دہ ہونے کا تصور ختم ہو گیا۔ اگرچہ بیعت اب بھی قائم تھی لیکن اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ اس کے ذریعے نئے خلیفہ کی اطاعت کا اعلان کیا جائے۔ اس دور میں دو بیعتوں کا رواج ہو گیا تھا۔ ایک بیعت عامہ اور ایک بیعت خاصہ۔ بیعت خاصہ میں فوجی سپہ سالار، امرا اور قضاة شامل ہوتے تھے اور بیعت عامہ میں عوام ہوتے تھے۔ بیعت عامہ علاقے کے والی یا قاضی کے ہاتھ پر کی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو عملاً امور سلطنت میں کوئی دخل نہیں تھا۔ ۲۳۶ھ میں متوکل کے دور میں ترکوں کا غلبہ ہوا اور ۳۳۰ھ تک حل و عقد کے اختیارات صحیح معنوں میں انہی ترک امرا کے ہاتھوں میں رہے۔ مفوض، ابوالعباس بن موفی، مقتدر ابن معتر اور قاہر باللہ انہی فوجی جرنیلوں کے ہاتھوں تخت نشین اور معزول ہوتے رہے۔ اس کے بعد

یوہہ برسر اقتدار آئے۔ انہوں نے خلیفہ کے اختیارات مکمل طور پر چھین لئے۔ غزالی کے الفاظ میں
 ”ان دنوں حکومت کا یہ حال ہے کہ یہ کلی طور پر فوجی حکومت بن کر رہ گئی ہے۔ جس کسی کو
 یہ فوجی جرنیل خلافت کے لئے نامزد کر دیں وہی خلیفہ ہو جاتا ہے۔“^{۲۱}

اس تاریخی جائزے سے ہم بڑی آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اموی دور میں قبائلی
 اور عصبی قوت حل و عقد کے اختیارات استعمال کر رہی تھی اور عباسی دور کے اواخر میں یہ پورے
 طور پر فوجی جرنیلوں کے ہاتھ میں چلی گئی، علما اور قضاہ کو فوجی جرنیلوں کا سا قوت و اختیار حاصل
 نہیں تھا۔ تاہم ان کو سلطنت کے زعماء میں شمار کیا جاتا تھا اور بیعت خاصہ میں شامل رکھے جاتے
 تھے۔ قانونی اور فقہی امور میں ان کی رائے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ کبھی ان سے اجماعی فتویٰ نہیں
 لیا گیا۔ بلکہ اکثر ان کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ امور سلطنت میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیں۔ یہ
 بظاہر کچھ ناروا سا معلوم ہوتا ہے لیکن بہر طور اس سے اس حقیقت کی غمازی ضرور ہوتی ہے کہ
 ان کو بھی اہل حل و عقد کا جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا۔

(۲)

مندرجہ بالا تاریخی جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ اہل حل و عقد کسی متعین گروہ یا مجلس کا نام نہیں
 رہا ہے۔ بلکہ اس اصطلاح کا اطلاق ان تمام ارباب اختیار پر ہوتا رہا ہے جنہیں حل و عقد کے اختیارات
 حاصل تھے (فارسی میں ”ارباب بست و کشاد“ اس سے بڑی دلچپ لغوی اور معنوی مشابہت رکھتا ہے،
 قرآن مترادف معنی میں اوی الاصل کا لفظ استعمال کرتا ہے اور ان کی اطاعت واجب قرار دیتا ہے۔^{۲۲}
 اولین دور کے مفسرین نے اوی الامر کی تفسیر میں عموماً امراء اور عمال کو شامل کیا ہے اگرچہ
 بعض نے اس کا اطلاق محض سرایا کے امیروں پر کیا ہے۔^{۲۳} بعض نے اس سے حلقائے راشدین^{۲۴}
 اور بعض نے ائمہ معصومین^{۲۵} مراد لیا ہے۔ امام اشعری جنہوں نے واضح طور پر اہل حل و عقد کی اصطلاح
 استعمال کی ہے۔ اس سے اہل علم و معرفت مراد لیتے ہیں۔^{۲۶} رازی۔ شہاب الدین ماکی۔ نسفی اور جمہور
 اصولیین کے ہاں اس سے علماء اور اہل اجتہاد مراد ہیں۔ سعد الدین تقنازانی نے اس کے مفہوم میں
 علماء کے ساتھ ساتھ سرکردہ ارباب ملت کو بھی شامل کیا ہے۔^{۲۷} شاہ ولی اللہ ان میں فوجی امراد کو بھی شامل
 کرتے ہیں۔

اصولین کے ہاں اس کی تعبیر میں اختلاف کی بڑی وجہ سیاسی صورت حال رہی ہے چنانچہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اصولیین ان کے وظیفے کے تعین میں اختلاف کرتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے دائرہ اطلاق کو وسیع یا تنگ کرتے رہے ہیں۔ جن اصولیوں نے محض تشریح اور قانون سازی تک حل و عقد کے دائرہ عمل کو محدود دیکھا انہوں نے مجتہدین اور علما کو اہل حل و عقد قرار دیا۔ جنہوں نے ذرا وسعت دے کر قضا اور عدل کو بھی اس مفہوم میں شامل کیا انہوں نے قضا و عدل کو بھی اہل حل و عقد کے دائرے میں لے لیا۔ دراصل ان دنوں نظام حکومت نہ آج کی طرح پیچیدہ تھا کہ اختیارات کی تقسیم اور تحدید کا مسئلہ زیر غور آتا۔ نہ آج کی طرح منظم تھا کہ ان اداروں کا تعین ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے تینوں بڑے شعبے عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ اس کے تحت لئے جاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اصولیین کے ہاں اس بارے میں اختلاف ہے۔ عام طور پر اہل حل و عقد سے بحث کرتے ہوئے وہ ان کے دو ذیلیے بیان کرتے ہیں۔

۱۔ انتخاب خلافت :

فقہاء کے نزدیک یہ سب سے اہم فریضہ رہا ہے۔ اگرچہ عملاً ان کی حیثیت صرف بیعت کرنے والوں کی تھی لیکن فقہانے انہیں انتخاب کنندگان میں شمار کیا ہے۔ اسی لئے ان کے نزدیک امامت کے انعقاد کے لئے اہل حل و عقد کی رضامندی لازمی ہے۔ ماوردی کہتے ہیں۔

والتقدت بیعتهم له الامامة - ان اہل حل و عقد کی بیعت سے اس (باع،
فلزم كافة الامم الدخول فی بیعتہ کی امامت منعقد ہوگی۔ چنانچہ تمام پر اس کی
والا لفقیا و اطاعتہ - بیعت کرنا اور اس کی اطاعت کرنا واجب ہو جاتا ہے۔

چنانچہ جب اہل حل و عقد کسی کی خلافت پر متفق ہو جائیں تو امت پر ان کی اطاعت واجب ہے۔ اس سے دور جدید کے مفکرین کو بھی اتفاق ہے۔ رشید رضا لکھتے تھیں۔

فمؤلاء (ای جماعت اہل الحل و العقد)، پس یہ لوگ اہل حل و عقد، اگر کسی امر پر
اذا اتفقوا علی امر او حکم وجب ان متفق ہو جائیں تو ان کی اطاعت واجب
یطاعوا فیہ - ہو جاتی ہے۔

فقہانے یہاں ایک اور دلچسپ سوال پیدا کیا ہے کہ اگر اہل حل و عقد کسی کی امامت پر اتفاق کر لیں، لیکن وہ شخص رضامند نہ ہو تو کیا صورت ہوگی۔ ماوردی اور جمہور فقہاء کے نزدیک اگر وہ شخص انکار کر رہا ہو تو اسے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔^{۳۳} لیکن تمام فقہاء کو اس سے اتفاق نہیں۔^{۳۴}

اس ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ اہل حل و عقد میں سے کم از کم کتنے افراد کا اتفاق ضروری ہے؟ اس سلسلے میں فقہاء سے حیران کن حد تک مختلف اقوال منقول ہیں۔ ان کی تعداد ایک سے لے کر چھ تک بیان کی جاتی ہے۔ ماوردی نے فقہاء کے اس اختلاف سے بحث کے لئے الگ باب باندھا ہے۔ فقہائے اہل سنت عموماً اہل حل و عقد میں سے صرف ایک کی رائے کو امامت کے انعقاد کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اشعری^{۳۵}، ماوردی^{۳۶}، ابن ہمام^{۳۷}، غزالی^{۳۸} اور قاضی عسقلان^{۳۹} سب اسی اصول کی حمایت کرتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کی خلافت کا انعقاد صرف ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کی رائے سے ہوا تھا۔

اس ضمن میں ماوردی نے ایک گروہ کی یہ دلیل بھی نقل کی ہے کہ حضرت عباسؓ نے حضرت علیؓ سے کہا تھا کہ اپنا ہاتھ بڑھائیے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں۔ تاکہ لوگ کہیں کہ نبیؐ کے چچا نے نبیؐ کے چچا زاد کی بیعت کر لی ہے۔ اور اس پر کوئی جھگڑا نہ ہو۔ یہاں تک کہ دو آدمی بھی اس سے اختلاف نہ کریں۔ اس سے نتیجہ نکالتے ہوئے ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح حضرت عباسؓ ایک ہی حضرت علیؓ کی خلافت کی تجویز کرنے والے تھے۔ لہذا صرف ایک شخص کی نامزدگی بھی قانونی حیثیت رکھتی ہے۔^{۴۰}

کو فیوں کا تو عموماً یہی عقیدہ رہا کہ خلافت کے لئے اہل حل و عقد میں سے صرف ایک شخص کی نامزدگی کافی ہے لیکن دوسرے فقہاء عام طور پر اکثریت کے اتفاق کے قائل رہے۔ بلکہ ابوبکر الاصحٰم (۶۷ھ) مشہور معتزلی کا عقیدہ تھا کہ امامت کے انعقاد کے لئے جمہور امت مسلمہ کا اتفاق ضروری ہے تاہم کم از کم تعداد جس پر بالعموم اتفاق رہا، پانچ ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ سفیہ بنتی ساعدہ میں ابوبکرؓ کی پہلی بیعت میں پانچ صحابہ شامل تھے۔ حضرت عثمانؓ کے انتخاب کرنے والوں کی تعداد بھی یہی ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک خلافت کے انتخاب کے لئے کم از کم پانچ کا اتفاق ضروری ہے۔

ب۔ تشریح۔

یہ اس مجلس کا بنیادی ذریعہ ہے۔ مسلم معاشرہ کے نشو و ارتقا کے لئے پیش آمدہ مسائل کا

حل تلاش کرنا ضروری تھا۔ فقہانے اہل حل و عقد سے مراد ہی مجتہدین لئے ہیں چنانچہ شہاب الدین مالکی
اجماع کی تالیف کرتے ہوئے کہتے ہیں :

الاجماع هو اتفاق اهل الحل والعقد من
هذه الامة في امر من الامور ونعني
باهل الحل والعقد المجتهدين في الاحكام
الشرعية۔

اجماع سے مراد امت کے اصحاب حل و عقد کا
کسی امر پر اتفاق ہے اور اہل حل و عقد سے ہماری
مراد شرعی احکام میں اجتہاد کے اہل لوگ
ہیں۔^۱

امام رازی کے نزدیک علماء کو اسی لئے اہل حل و عقد میں شمار کیا گیا ہے کہ وہ قانون سازی میں حصہ
لیتے ہیں۔

ان الاجماع لا ينعقد الا بقول العلماء
الذين يكتصم استنباط احكام الله من نصوص
الكتاب والسنة، وهؤلاء هم المسنون
باهل الحل والعقد۔

اجماع حقیقتاً ان علماء کے قول کے بغیر منعقد
نہیں ہو سکتا جنہیں کتاب و سنت کی نصوص
سے احکام الہی کے استنباط کی قدرت نہ ہو اور
انہی (علماء) کو اہل حل و عقد کا نام دیا گیا ہے۔^۲

اس باب میں سب سے اہم مسئلہ جو سب سے زیادہ نظر انداز رہا ہے اس ادارے کی تشکیل کا مسئلہ ہے
اصولیت کے ہاں جو انتشار اور اختلاف ہے اس کی بڑی وجہ بھی یہی الجھن ہے۔ اور اسی کی وجہ سے
خود یہ تصور بے حد مبہم ہو گیا ہے۔ دستوری قانون کی تشکیل میں انہوں نے ہمیشہ تاریخ کی تعبیر سے
کام لیا۔ جیسا کہ موضوع زیر بحث سے واضح ہو چکا ہے۔

ایک لحاظ سے یہ بہت ہی مناسب طریق کار تھا کہ بدلتے ہوئے حالات کے لئے قانون میں
لچک رکھی جائے۔ یہ بات خود ان بیدار مغز فقہاء کی خواہشوں کے برعکس ہوگی کہ ہم آئندہ کے لئے
اس طرز فکر کو ختم کر دیں اور ایک قسم کی رجعت پرستی کو اپنائیں جس سے ہم وقت کے ایک مختصر سے وقفہ
میں محدود ہو کر رہ جائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس تصور میں ایسی مبادیات موجود ہیں جو ہمارے سیاسی نظام کی اساس بن سکتی ہیں۔
اس کی جزئیات میں جہاں خلا نظر آتا ہے اسے ہم جدید وسائل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پُر کر کے
قابل عمل بنا سکتے ہیں۔